Research Journal
Tahqeeqat
جلد:4، شمارہ:4، 2025ء
eISSN: 2791-0342
pISSN: 2791-0334
ریسرچ جرنل
تحقیقات

فہمیدہ ریاض کی نظموں میں تشکیکی عناصر

"Sceptical Elements in Fehmida Riaz's Poems"

Razwan Anwar
PhD Urdu Scholar,
University of Education, Lahore
Dr. Ammara Tariq
Associate Professor Department of Urdu, University of Education, Bank Road, Lahore

رضوان انور
پی ایچ۔ڈی اردو اسکالر یونیورسٹی آف ایجوکیشن، لاہور
ڈاکٹر عمارہ طارق
ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبہ اردو یونیورسٹی آف ایجوکیشن، بنک روڈ، لاہور

Abstract

Skepticism is a thought provoking feature in the poetry of Fehmida Riaz. Her poetic vision is characterized by an unwavering desire to question, explore, and redefine the limits of thought and belief. She challenges established traditions, strict moral codes, and social conventions that inhibit individuality and critical thinking. Riaz's skepticism is both intellectual and emotional, stemming from her awareness of societal contradictions and the complexities of human nature. Through her poetry, she deeply examines the harsh realities of life, the oppression of women, and the hypocrisy that often lies beneath cultural and religious norms. Instead of accepting truths dictated by authority, she advocates for rediscovering them through personal experience and rational inquiry. For her, doubt is not a denial but an awakening to think beyond surface appearances and seek the essence of truth. Her poetry encourages readers to engage in this questioning process: to ask what truth really signifies, how reality should be understood, and whether our accepted beliefs are worthy of trust. In this way, skepticism becomes a tool for enlightenment and liberation. It allows her to express defiance against stagnation and to promote a more liberated, conscious mode of thought . Thus, Fehmida Riaz's poetic skepticism turns doubt into discovery, rebellion into contemplation, and poetry into a journey of intellectual and spiritual awakening.

Keywords: *Skepticism, doubt, uncertainty, lack of conviction, hesitation, contemplation, indecision, feminist thought, social inequality, political oppression, quest for truth, reason and logic, self-realization, inner turmoil, reproductive power, stoning, full moon, rebellion, dream of freedom, feigned ignorance, conflict.*

کلیدی الفاظ: تشکیک، شک، گمان، عدم یقین، پس و پیش، تامل، تذبذب، تانیثی فکر، سماجی ناہمواری، سیاسی جبر، حقیقت کی جستجو، عقل و استدلال، خود شناسی، داخلی اضطراب، تولیدی صلاحیت، رجم، پورا چاند، بغاوت، آزادی کا خواب، تجاہلِ عارفانہ، کشمکش

اردو ادب کی ممتاز شاعرہ، فکشن نگار اور مترجم فہمیدہ ریاض (۱۹۴۶ء۔۲۰۱۸ء) کا تعلق میرٹھ بھارت سے تھا مگر تقسیمِ ہند کے بعد ان کا خاندان پاکستان منتقل ہو گیا۔ ابتدائی تعلیم حیدرآباد سندھ میں حاصل کی۔ فارسی ادب میں گریجوایشن کیا اور کچھ عرصہ ریڈیو پاکستان سے بھی منسلک رہیں۔ جنرل ضیاء الحق کے دور میں فہمیدہ ریاض کو متنازع سیاسی خیالات کے باعث مقدمات کے علاوہ جلاوطنی بھی اختیار کرنا پڑی۔ انھوں نے چند

برس بھارت میں قیام کیا اور وہاں بھی ادبی سرگرمیوں کو جاری رکھا "ہمرکاب" اسی دور کی یادگار ہے۔ بعد ازاں پاکستان واپس آئیں اور مختلف قومی اداروں میں فرائض انجام دیے۔ فہمیدہ کی شاعری نے جلد ہی اردو ادب میں اپنی پہچان بنائی۔ ان کے شعری مجموعوں میں پتھر کی زبان، بدن دریدہ، دھوپ، کیا تم پورا چاند نہ دیکھو گے، ہم رکاب اور آدمی کی زندگی شامل ہیں، مَیں مٹی کی مورت ہوں اور سب لعل و گہر ان کے شعری کلیات ہیں۔ وہ اردو ادب میں تانیثی فکر کی ایک معتبر نمائندہ کے طور پر مانی جاتی ہیں۔ وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہیں۔ ان کے شعری موضوعات میں سماجی ناہمواری اور طبقاتی تقسیم کے خلاف احتجاج، آمریت اور جبر کی مخالفت، خواتین کے مسائل اور نسائی شعور کو اجاگر کرنا، عدل و انصاف اور آزادی کے لیے آواز بلند کرنا وغیرہ شامل ہے۔ ان کا شمار فیض احمد فیض اور دیگر ترقی پسند شعرا کی صف میں کیا جاتا ہے البتہ انھو ں نے اپنی انفرادیت بھی برقرار رکھی اور خاص طور پر نسائی نقطۂ نظر کو زیادہ شدت اور جرات کے ساتھ پیش کیا۔

فہمیدہ ریاض نے اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کے لیے نظم کا راستہ اپنایا۔ ان کی ابتدائی نظمیں "فنون" میں شائع ہوئیں۔ انھوں نے اپنی شاعری میں عورت، معاشرہ اور وجودی مسائل کو جس جرات اور فکری گہرائی کے ساتھ پیش کیا ہے اس سے اردو نظم میں ایک نیا زاویہ سامنے آیا۔ ان کی تخلیقات محض جذباتی اظہار نہیں بلکہ فکری مکالمہ بھی ہیں جن میں یقین و عدمِ یقین، روایت و بغاوت اور وجود و عدم کے سوالات نمایاں ہیں۔ اس طرح کے سوالات ان کی شاعری میں تشکیکی رجحان کو جنم دیتے ہیں۔ ان کی نظموں میں قاری کا ذہن مستقل طور پر تلاش و تردید کی کیفیت میں رہتا ہے یہ پہلو انھیں دیگر شعرا سے ممتاز بناتا ہے۔ اس پہلو کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان کی نظموں میں موجود تشکیکی عناصر کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ پیش کیا جارہا ہے۔ شک، شبہ، احتمال، اشتباہ، تردد، تامل، تذبذب، گمان، وہم، ہچکچاہٹ، عدم یقین کی کیفیت، پس و پیش، شک میں پڑنا، شک میں ڈالنا، اشیا و تصورات کی حقیقت و ماہیت پر شبہ کرنا، دو یا زائد چیزوں میں سے کسی ایک کا انتخاب نہ کر سکنا، دو یا متعدد تصورات میں فرق نہ کر پانا، تذبذب میں کوئی نتیجہ اخذ کرنے سے قاصر رہنا، اپنے علم میں شک کرنا، اپنی ذات میں شک، مظاہر فطرت میں شک، مذہبی عقائد و نظریات میں شک کرنا، سوال کرنا وغیرہ تشکیک کے مفاہیم و مترادفات میں سے ہیں۔ مذہبی تشکیک، فلسفیانہ تشکیک، سائنسی تشکیک اور سماجی تشکیک وغیرہ اس کی معروف اقسام ہیں۔

تشکیک (Scepticism/ Skepticism) ایک ایسا نظریہ ہے جو موجودہ عقائد، نظریات اور روایات کو بغیر سوال کیے قبول کرنے کے بجائے ان پر تنقیدی نظر ڈالتا ہے۔ فلسفے میں سقراط، ڈیکارٹ، ہیوم اور رسل جیسے مفکرین نے اس تصور پر کام کیا۔ اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کے تحت تشکیک پسندی کو زیادہ جگہ ملی جہاں شاعروں اور ادیبوں نے مذہبی، سماجی اور سیاسی تصورات پر سوالات اٹھائے۔ فہمیدہ ریاض بھی اسی روایت کا حصہ رہیں۔ وہ اردو ادب کی ایک منفرد اور باغی شاعرہ کے طور پر معروف ہیں۔ ان کی شاعری میں روایت شکنی، نسائی شعور، اور سماجی و سیاسی تنقید کے ساتھ ساتھ تشکیک پسندی کے نمایاں عناصر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ وہ محض روایات کو اپنانے کے بجائے ان پر سوال اٹھاتی ہیں اور قاری کو غور و فکر پر مجبور کرتی ہیں۔ ان کے ہاں روایتی تصورات، اقدار اور سماجی بندشوں پر شک اور سوال اٹھانے کا رویّہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ محض

بغاوت برائے بغاوت نہیں کرتی بلکہ یقین کے بجائے تجربے اور مشاہدے کو بنیاد بناتی ہیں تاکہ چیزوں کی اصلیت وماہیت واضح ہو۔ ان کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں خالدہ حسین رقم طراز ہیں:

"چونکہ وہ فطری طور پر ایک باغی عورت ہے اس لیے وہ اپنے موضوعات پر کوئی قدغن برداشت نہیں کرتی، وہ زندگی کو اس کی سادی حقیقت سے عاری سمجھنے سے انکار کرتی ہے۔ سو شروع ہی سے اس کے ہاں ایک ایسی عورت نظر آتی ہے جو روایت کے مطابق نہ تو اپنے عورت ہونے پر شرمندہ اور ملول ہے نہ ہی قہراً اور جبراً اپنے آپ کو قبول کرنے کی قائل۔"(۱)

فہمیدہ ریاض کے اولین مجموعہ کلام "پتھر کی زبان" میں شامل نظم "کبھی کبھی" کا اختتامی شعر انسان کے جذبات اور داخلی تضاد کی عکاسی کرتا۔ شاعرہ ایک طرف یقین کی بنیاد پر امید رکھتی ہے یہ کہ وہ عقل واستدلال سے کسی نتیجے پر پہنچ چکی ہے البتہ دوسری طرف دل کی کیفیت اور موجودہ اداسی اس یقین کو مکمل تسکین نہیں دے پاتی۔ ایک سطح پر سوچ ویقین ہے تو دوسری سطح پر جذبات کی غیر یقینی کیفیت۔ یہ حالت انسانی شعور اور احساسات کے درمیان مسلسل کشمکش، امید اور اداسی کے متضاد تجربات کو اجاگر کرتی ہے:

اسی یقین پر مری امید کی اساس ہے۔
مگر مَیں کیا کروں کہ آج دل بہت اداس ہے(۲)

"بدن دریدہ" کی افتتاحی نظم "تصویر" میں شاعرہ نے خودی اور خودشناسی کا فلسفہ بیان کیا ہے۔ اس نظم میں ایک ایسی لڑکی کی داخلی کیفیت کو اجاگر کیا گیا ہے جو محبت میں مخلص ہے لیکن اسے بدلے میں عدم توجہی اور دھوکے کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ نفسیاتی طور پر دیکھا جائے تو اس کے جذبات کئی مراحل سے گزرتے ہیں مثلاً معصومیت اور اخلاص، بے یقینی اور اضطراب، تنہائی ومحرومی، مایوسی اور شکستہ دلی وغیرہ۔ ناواقفیت بھی تشکیک کی بنیاد بن کر سوال کو جنم دیتی ہے۔ پیش نظر اشعار ایک گہری داخلی کیفیت کو نمایاں کرتے ہیں جس میں شاعرہ اپنے وجود اور پہچان کے بارے میں سوالات کرتی ہے۔ انسان کا اپنی حقیقت، شناخت اور ادراک پر سوال اٹھانا تشکیک کا بنیادی تصور ہے۔ اس نظم میں ایک "پوشیدہ تصویر" کا استعارہ دراصل اس باطنی وجود یا اصل ذات کی علامت ہے، جسے شاعرہ بھی مکمل طور پر نہیں جانتی۔ تشکیک انسانی شعور کا وہ زاویہ ہے جہاں یقین کی گرفت ڈھیلی پڑتی ہے اور وجود کی اصل حقیقت پر سوالات جنم لیتے ہیں۔ انسان اپنے آپ کو پہچاننے کی جستجو میں کبھی اپنے ادراک پر شک کرتا ہے تو کبھی اپنی داخلی دنیا کو اجنبی محسوس کرتا ہے۔ ایسا اسلوب فہمیدہ کے اشعار میں نمایاں ہے کہ دل کے نہاں خانے میں چھپی تصویر کو دیکھ کر وہ اپنی ذات کے تعین میں ہچکچاہٹ اور لرزش محسوس کرتی ہے۔ گویا یہ ایک فلسفیانہ احساس ہے جس میں "میں کون ہوں؟" کا سوال شدت کے ساتھ ابھرتا ہے۔

مرے دل کے نہاں خانے میں اک تصویر ہے میری
خدا جانے اُسے کس نے بنایا کب بنایا تھا
یہ پوشیدہ ہے میرے دوستوں سے اور مجھ سے بھی

کبھی بھولے سے لیکن میں اُسے گر دیکھ لیتی ہوں
اُسے خود سے ملاؤں تو مرا دل کانپ جاتا ہے(۳)

"اے والی وربِّ کون و مکان" ایسی حمدیہ نظم میں رب تعالیٰ توصیف کے ساتھ ساتھ شاعرہ نے اپنے دل و دماغ میں پیدا شدہ سوالات کے ذریعے اپنا تجسس بیان کیا ہے۔ یہ کلام ایک ایسے باطنی تجربے کی جھلک ہے جس میں شکر گزاری اور حمد کے علاوہ سوال اور تذبذب بھی جنم لیتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ سوالات اور کئی لوگوں کے دل و دماغ میں ہوں لیکن ان کا مافی الضمیر گوشِ دیگراں تک نہ پہنچ سکا ہو۔ ان میں ایک طرف رب العالمین کی عظمت اور کائنات کی خوبصورتی کا اعتراف ہے تو دوسری طرف دل کے اندر گونجتا خلا اور دعا کی بے معنویت کا احساس۔ سجدوں میں تذبذب اور دعاؤں کی بے معنویت کا احساس مذہبی تشکیک کے زمرے میں آتا ہے یہ تصور ایمان و گمان کے درمیان شک اور کشمکش کو نمایاں کرتا ہے۔ اس میں تشکیک صرف سوال تک محدود نہیں بلکہ روحانی تجربے کو گہرائی دینے کا وسیلہ بھی ہے جو انسان کی فکری اور جذباتی کیفیت کو پیچیدہ اور معنی خیز بناتا ہے:

ڈوب گئی خاموشی میں مغرب کی اذاں
کیسا سکوت ہے والی وربِّ کون و مکاں
الحمدللہِ ربِّ العالمین۔۔۔
سب تعریف خدا کی، جو ہے بہت عظیم
کیسی سوچ نے میرے دل میں چٹکی لی
کیسے دھیان سے میری آنکھیں بھر آئیں
سینے میں کیوں سناٹا سا چھایا ہے
یہ میرے سجدے میں تذبذب کیسا ہے
لب پہ دُعائیں آ کے بنیں کیوں بے معنی
جیسے میرا اندر ہو سنسان اُجاڑ
کوئی تو آئے کوئی تو آ کر دستک دے
کیسے کھولوں اپنے دل کے بند کواڑ(۴)

نظم "دوجا سایہ" داخلی کرب اور پر اسرار کیفیت کو مجسم کرتی ہے۔ شاعرہ ماں اور بچے کے رشتے کو ایک مانوس سکون کے طور پر دیکھتی ہے البتہ اسی تعلق میں ایک اجنبی اور دھمکی آمیز سایہ بھی محسوس ہوتا ہے۔ ماں سوچتی ہے کہ اگر بچہ اُس کی کوکھ میں ڈھلا ہے تو پھر یہ "دوسرا سایہ" کس کا ہے؟ جو مسلسل بیچ میں آ کر رشتے کو مشکوک بنا دیتا ہے۔ جھولا جھولاتے ہوئے بچے کے چہرے کا بار بار تاریکی میں کھو جانا پھر گہوارے کی ڈوری

سے بندھے دو دھاری خنجر کی مثال زندگی کو شک اور عدم یقین کی گرفت میں دکھاتی ہے۔ بایں سبب پوری فضا میں ایک شک و سوال کی لہر جنم لیتی ہے۔ س میں محبت اور خوف، زندگی اور موت، اپنا اور اجنبی ایک دوسرے میں الجھتے دکھائی دیتے ہیں:

تو مری گود میں کھل کھل ہنستی چمپے کی سی کلی سہی
تیری جان کی ساری کایا میری کوکھ میں ڈھلی سہی
اس کمرے میں ہم تنہا ہیں یہ دوجا سایہ کس کا ہے
بار بار کیوں تیرا چہرہ تاریکی میں کھو جاتا ہے
کیسا دوہری دھار کا خنجر پلنے کی ڈوری سے بندھا ہے
جس میں میرا لہو رچا تھا، اس تن پر کیوں لرز رہا ہے(۵)

"کب تک" ایسی نظم ہے جس کے عنوان ہی سے شک کی پرچھائیں محسوس ہوتی ہے۔ اس نظم میں ایک شادی شدہ عورت اپنے خاوند سے فکری و جذباتی سوالات کرتی دکھائی دیتی ہے۔ یہ سوالات محض اپنے شوہر کی محبت کے دوام سے متعلق نہیں بلکہ انسانی رشتوں کی اصلیت، حقیقت اور ان کی پائیداری پر بھی گہرے شکوک اظہار ہیں۔ وہ پوچھتی ہے کہ کیا محبت صرف جسمانی حسن، جوانی اور تولیدی صلاحیت تک محدود ہے یا اس سے آگے بھی کوئی رشتہ قائم رہ سکتا ہے؟ علاوہ بریں مزید شکوک دل و دماغ میں گھر کر لیتے ہیں مثلاً زندگی کے سفر میں جب جسم کی تازگی ماند پڑ جائے تو کیا دلوں کی قربت باقی رہتی ہے یا سب کچھ ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے؟ اس طرح کے سوالات نظم کو ایک وجودی اور فکری جہت دیتے ہیں جن کے نتیجے میں محبت کے مادی پیمانوں پر سوال اٹھتا ہے اور رشتے کی معنویت مشکوک ہو کر رہ جاتی ہے:

کب تک مجھ سے پیار کرو گے؟
کب تک؟
جب تک میرے رحم سے بچے کی تخلیق کا خون بہے گا
جب تک میرا رنگ ہے تازہ
جب تک میرا انگ تنا ہے
پر اس سے آگے بھی تو کچھ ہے
وہ سب کیا ہے؟
کسے پتہ ہے؟
وہیں کی ایک مسافر میں بھی
انجانے کا شوق بڑا ہے
پر تم میرے ساتھ نہ ہو گے تب تک)٦)

"بدن دریدہ" کے عنوان سے درج ذیل نظمیہ بند شدید داخلی کرب اور زوال کی کیفیت کا غماز ہے۔ شاعرہ نے جسم اور روح کے بکھرنے کو ایک سیاہ لہر کے بہاؤ میں ڈھلتے ہوئے دکھایا ہے۔ اس کیفیت میں زندگی اور موت کی سرحدیں مدھم ہو جاتی ہیں۔ خون کا بہاؤ، جسم کا ساتھ چھوڑ دینا، اور ہر سانس کا بوجھل اور آخری لمحے کی طرح محسوس ہونا یہ سب مل کر موت، بے ہوشی اور خواب کے بیچ ایک مبہم و تشکیکی کیفیت پیدا کرتے ہیں شاعرہ کو سمجھ نہیں آ رہی کہ اس حالت کو کیا نام دے کیا یہ نیند ہے، بے ہوشی ہے یا موت؟ اس نظم میں انسان کے وجود پر چھائے اندیشے اور فنا کا سایہ نہ صرف جسمانی درد کو ظاہر کرتا ہے بلکہ روحانی اضطراب کو بھی اجاگر کرتا ہے:

اک سیہ لہر بہائے لیے جاتی ہے مجھے!
خوں روانی سے بدن چھوڑ رہا ہو جیسے
نیند ہے موت ہے یا یہ کوئی بے ہوشی ہے
اب تو ہر سانس دمِ باز پسیں لگتی ہے)۷)

فہمیدہ کے ہاں تشکیک میں ملفوف جنسی اشارے بھی ملتے ہیں۔ اسے اپنی شاعری میں جنسیت کے بیان کا بخوبی اندازہ ہے۔ وہ جنسی عمل کو فرد کی ذات اور وجود کا اثبات قرار دیتی ہے۔ نظم "ابد" میں ایک ایسی کیفیت بیان کی گئی ہے جس میں جسمانی لذت اور اس کے اثرات حیرت و سوال کے دائرے میں سمٹ آتے ہیں۔ شاعرہ اپنے تجربے کو سراسر یقینی یا واضح نہیں مانتی بلکہ ہر احساس کو "کیا ہے؟" کے سوالیہ پیرائے میں رکھتی ہے۔ اس پہلو سے جسمانی سرور اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی کیفیت محض سرشاری نہیں بلکہ ایک ابہام بن کر سامنے آتی ہے۔ اس طرح لذت، بوجھل پن اور سانس کی ٹوٹ پھوٹ سب تشکیک کے پردے میں ڈھل جاتے ہیں۔ یہ شاعرانہ کمال ہے کہ مذکورہ نظم میں جسمانی وصل کے پردے میں نزع کی کیفیات بیان کی گئی ہیں:

یہ کیسی لذت سے جسم شل ہو رہا ہے میرا
یہ کیا مزا ہے کہ جس سے ہے عضو عضو بوجھل
یہ کیف کیا ہے کہ سانس رُک رُک کے آ رہا ہے)۸)

مذہبی اصطلاحات اور موضوعات پر مبنی نظمیں بھی فہمیدہ ریاض کے کلام کا حصہ ہیں جو انھوں نے اپنے خاص رنگ میں لکھی ہیں۔ جن میں تشکیکی عناصر بھی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہیں۔ "رجم" ایک دینی اصطلاح ہے جو زنا کرنے والے مرد و زن کو بطورِ سزا زمین میں گاڑ کر سنگسار کر کے ہلاک کرنے کو کہتے ہیں۔ فہمیدہ کی نظم "رجم" بھی اسی پس منظر میں ہے۔ عنوان کے نیچے جملہ معترضہ لکھا گیا ہے کہ "ابن عمر سے روایت ہے کہ جب بدکاری کرنے والے جوڑے کو سنگسار کیا گیا تو مرد عورت پر جھک جھک جاتا اور اُسے پتھروں سے بچاتا۔

رجم کے ضمن میں شاعرہ نے انسانی جنس اور جنسی تلذذ کی خواہش کے پیچیدہ اور متضاد جذبات کو اجاگر کیا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ یہ خواہش انسان میں ایک قدیم، قدرتی اور جسمانی ضرورت کے طور پر کیوں موجود ہے؟ شاعرہ سوال اٹھاتی ہے کہ یہ "پاگل تن" کیوں اس کشش میں گرفتار ہے اور

کس طرح وحشی اور اداس خواہش انسانی وجود کو متاثر کرتی ہے۔ شاعرہ نے انسانی فطرت اور تخلیق کی پیچیدگی پر شک کو اجاگر کیا ہے۔ وہ ربّ تعالیٰ سے بھی سوال کرتی دکھائی دیتی ہے۔ آدمی کے اس جذبے پر سوال اٹھاتی ہے کہ کیسے ایک انسان لذت اور جسمانی خواہشات کا طلب گار ہو سکتا ہے؟ مرد و عورت کو سنگسار کرنے کے تناظر میں انسانی بدن کی بے بسی، درد اور لذت کا امتزاج تشکیک کی شدت کو بڑھاتا ہے اور قاری کو انسان کی فطرت، جسمانی جذبات اور اخلاقی حدود کے بارے میں غور و فکر پر مجبور کرتا ہے۔ تشکیک یہاں صرف سوال نہیں بلکہ انسانی وجود، قدرت اور اخلاقی تضاد کی پیچیدگیوں کے ادراک کا ایک ذریعہ ہے۔ زخم، لذت، بے تابی اور برزخ کے نغمات، انسانی فطرت کی الجھن اور تضاد کی نمائندگی کرتے ہیں۔ زیر نظر اشعار میں فلسفیانہ تشکیک کا پہلو نمایاں ہے کیوں کہ ان میں اسلامی نظام عدل پر شک نہیں کیا گیا بلکہ انسانی فطرت اور وجود کے اسرار و رموز پر غور و فکر کی سعی کی گئی ہے یعنی ایمان کی نفی یا اس پر شک کے بجائے عقل و فہم کی جستجو نظر آتی ہے:

پاگل تن میں کیوں بستی ہے
یہ وحشی تاریک آرزو
بہت قدیم اُداس آرزو
تاریکی میں چھپ جانے کی
اک لمحے کو
ربّ قہار! یہ معجزہ کیا ہے!
تیرا خلق کیا ہوا آدم
لذتِ سنگ کا کیوں خواہاں ہے
اس کی سحر زدہ چیخوں میں
یہ کس برزخ کا نغمہ ہے
کیا تھی بدن کے زخم کی لذت
بے تابی سے یوں رقصاں ہے
ہر بُنِ مو سے سرخ و سیاہ لہو کا دریا ابل پڑا ہے(۹)

ظلم و زیادتی کے خلاف کلمۂ حق کی صدا بلند کرنا اہل دل کا وتیرہ ہے۔ شاعرہ ظلم اور ناانصافی کے خلاف آواز اٹھانے کا وعدہ کر چکی ہے اور وہ اپنا یہ وعدہ وفا کرنا چاہتی ہے۔ اس ضمن میں وہ کچھ بھی چھپا کر نہیں رکھنا چاہتی بلکہ سب کچھ سچ سچ بتا دینا چاہتی ہے۔ پورے سچ کو وہ "پورے چاند" سے تشبیہ دیتی ہے۔ پورا سچ سننے کے لیے بھی حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے لہٰذا سچائی کو اس کی مکمل شکل میں دیکھنا چاہیے نا کہ چند خامیوں یا کمزوریوں کی وجہ سے اسے رد کر دینا چاہیے۔ زیر نظر اشعار میں شاعرہ نے سچائی اور خوف کے بارے میں سوالات اٹھائے ہیں۔ وہ قاری کو جھنجھوڑتی ہیں کہ کیا واقعی سچ بدصورت ہو سکتا ہے؟ کیا خوف کی کوئی پہچانی جانے والی شکل ہے؟ یہ سوالات قاری و سامع کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں کہ حقیقت اور

خوف کی اصل صورت کیا ہے؟ شاعرہ نے چاند کے داغ کو مثال کے طور پر پیش کیا ہے کہ خامیوں کے باوجود حقیقت اپنی روشنی نہیں کھوتی۔ علاوہ بریں خوف کو بھی ایک پراسرار اور مبہم وجود بتایا گیا ہے جس کی اصل شکل انسان کے لیے ہمیشہ ڈھکی چھپی رہتی ہے:

مجھے سب کچھ سچ سچ بتانے دو
مجھے کچھ بھی
مت چھپانے دو
سب کچھ.... پورا سچ!
ڈرو مت، پورا سچ بدصورت نہیں ہوتا
اس میں جو کچھ بدنما ہے وہ تو چاند کے داغ کی مانند ہے
کیا تم پورا چاند نہ دیکھو گے؟
کیا تم نے کبھی خوف کی شکل دیکھی ہے؟
.....شاید کسی نے بھی نہیں دیکھی
اس کا چہرہ سفید پٹیوں سے ڈھکا ہوتا ہے
اور ہاتھوں میں انجانے حکم نامے ہوتے ہیں
جن کی تعمیل.....
بھیانک خواب کی مانند
بے جوڑ اور مبہم ہے(۱۰)

انسان کے قلب و لسان کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ زبان، دل کی نقیب ہوتی ہے کیوں کہ دل کے خیالات زبان ہی کے ذریعے الفاظ کا لبادہ اوڑھ کر دوسروں تک پہنچتے ہیں۔ مگر بعض اوقات اس تعلق میں ایک شک اور تذبذب پایا جاتا ہے۔ شاعرہ یہاں اسی کشمکش کو بیان کرتی ہے کہ دل کی کیفیت اور زبان کا اظہار ہمیشہ یقینی نہیں ہوتا، بلکہ وہ شک، امکان اور تبدیلی کے عمل سے گزرتا ہے۔ یہ صورت تشکیکیت کو مزید واضح کرتی ہے کہ جو کیفیت آج اور ابھی ہے یہ حتمی نہیں، ممکن ہے آئندہ لمحے حالات مختلف ہوں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دل کی بات جھوٹ معلوم ہوتی ہے اور انسان اسے کہنے سے ہچکچاتا ہے، لیکن تا کجا؟ یہی بات کل کو زبان تک پہنچ کر سچائی کا روپ بھی دھار سکتی ہے۔ تشکیک پسندوں کا کہنا ہے کہ اس دنیا میں کوئی چیز حتمی نہیں، کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ کوئی کام جو سال ہا سال سے ہوتا آرہا ہے اس کی بابت یقین سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آئندہ بھی ایسا ہی ہو گا:

جو بات آج دل میں آتے ہوئے بھی

اپنے ممکنہ جھوٹ پر شرماتی ہے
کیا عجب کہ کل ہونٹوں تک آ پہنچے
اور وہ بھی اس شان سے کہ سچ بن کر!(۱۱)

معاشرے میں سیاست دانوں، کارکنوں اور سیاسی قیدیوں کے خلاف شکوک کو آسانی سے ہوا دی جاسکتی ہے۔ ایسے ماحول میں گواہی اور تفتیش حقیقت کے تعین کا عمل نہیں رہتی بلکہ پہلے سے قائم بدگمانیوں کو ثابت کرنے کی کوشش بن جاتی ہے۔ زیرِ نظر اشعار میں ایسی ہی فضا کی عکاسی ملتی ہے جن میں سیاسی بدگمانی کو شعری صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ "کیا تم پورا چاند نہ دیکھو گے" کا چوتھا باب جام ساقی کے مقدمے میں گواہی کا منظر نامہ لیے شروع ہوتا ہے جس میں شاعرہ فہمیدہ ریاض بطور گواہ پیش ہوتی ہیں۔ جام ساقی سندھ کے ایک معروف سیاسی اور سماجی کارکن تھے جو ترقی پسند سیاست اور بائیں بازو کی تحریک سے وابستہ رہے۔ ان کا تعلق کمیونسٹ پارٹی، مزدور، کسان اور محنت کش طبقے کی جدوجہد سے تھا۔ ضیاء الحق کے دورِ آمریت میں وہ سیاسی قیدی رہے اور انھیں "حیدرآباد سازش کیس" میں بھی شامل کیا گیا۔ بایں سبب جام ساقی کو آمریت اور جبر کے خلاف اور جمہوریت، مساوات اور انسانی حقوق کے حق میں آواز بلند کرنے والے رہنما کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ برٹرینڈ رسل کے تشکیکی مضامین میں شامل ایک مضمون "سیاسی تشکیک کی ضرورت" کے عنوان سے ہے۔ جس میں وہ کہتا ہے:

"تشکیک پسندی بڑے پیمانے پر ممکن ہے۔ نفسیاتی طور پر اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی دشمنی کا ہدف دوسری قوموں اور دوسرے معاشرتی طبقوں کے بجائے سیاست دانوں کو بنائیں۔ مگر کیوں کہ کوئی بھی دشمنی سیاست دانوں کی مدد کے بغیر موثر نہیں ہو سکتی اس لیے جس دشمنی کا ہدف وہ خود ہوں گے وہ نفسیاتی طور پر سکون تو دے سکتی ہے لیکن انھیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔")۱۲)

فہمیدہ کے کلام میں ایسی کیفیت بھی دیکھنے کو ملتی ہے جس میں شاعرہ ایک متکلم کی حیثیت سے شدید بے یقینی، اندھیرے اور خاموشی سے گزر رہی ہے۔ اس کا وجود خلا میں معلق ہے کہ جہاں الفاظ کی بازگشت بھی نہیں سنائی دیتی۔ دوران تفتیش یا گواہی اس پر سوالات ہر طرف سے یلغار کی طرح وارد ہوتے ہیں، مگر ان کے جواب کہیں سے نہیں ملتے۔ یہ منظر نامہ انسان کے ذہنی انتشار، کائناتی خاموشی اور سماجی دباؤ کو آشکار کرتا ہے۔ جس سے تشکیک اور تذبذب کی فضا میسر آتی ہے۔ شاعرہ اس فضا میں گواہ کی حیثیت سے متعدد سوالوں کا سامنا کرتی ہے۔ اس سرگزشت کو وہ قرطاس پر منتقل کر دیتی ہیں:

کتنا اندھیرا ہے۔۔۔
سوالوں کے بے آواز تاریک سیارے
ادھر سے اُدھر نکل جاتے ہیں
"کیا تم اس شخص کو جانتی ہو؟"
"کیسے؟"
"کب سے؟"

"کیا یہ غدار نہیں؟"

"یہ کیونکر غدار نہیں؟"(۱۳)

زیر نظر نظم (اے ارضِ وطن) میں شاعرہ اپنے وطن سے مخاطب ہو کر اس پر چھائے ظلم و جبر، خونریزی اور ناانصافی پر کرب کا اظہار کرتی ہے اور سوال اٹھاتی ہے کہ یہ کیسا عذاب ہے جو آزادی کے بجائے بربادی لایا ہے۔ ان شعروں میں شاعرہ صرف دکھ بیان نہیں کرتی بلکہ اصل حقیقت کی تلاش میں سوال قائم کرتی ہے: یہ خون، یہ موت، یہ جبر، سب کس کے ہاتھوں کی دین ہے؟ کیا یہ بیرونی استعمار کا تسلسل ہے یا اندرونی استبداد کا نیا روپ؟ اس طرح نظم آزادی اور غلامی کے بیچ پھیلے دھندلکوں کو بے نقاب کرتے ہوئے قاری کو سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ وطن کی تقدیر کا اصل فیصلہ کن کون ہے، عوام یا جلاد؟ اس نظم میں شک کی نوعیت ماورائی اور سیاسی تشکیک کے امتزاج پر مبنی ہے۔ ایک طرف شاعر اللہ تعالیٰ سے سوال کر کے ماورائی عدل اور تقدیر پر شک ظاہر کرتا ہے کہ اگر سب کچھ اس کے حکم سے ہے تو پھر وطن ظلم و جبر کی تاریکی میں کیوں ڈوبا ہوا ہے؟ دوسری طرف یہ سوال سیاسی و سماجی نظام پر عدم اعتماد کا اعلان ہے کہ عوام کے خون اور قربانیوں کے باوجود آزادی کا خواب کیوں ایک بلا کی شکل اختیار کر گیا؟ آخر پر شاعرہ نے اپنے شکوک و شبہات دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا ہے کہ لوگ تو بتانے سے قاصر ہیں مگر اے دو عالم کے پالن ہار! تو ہی بتا کس چیز نے، کس بلا نے، کس آسیب نے میرے ملک پر اپنا تسلط جما رکھا ہے؟ ایسے سوالات کسی واضح جواب کے حصول سے بڑھ کر تشکیکی جستجو ہیں:

اے ارض وطن اے ارض وطن!
کیوں تیرے زخمی تن پہ اگی
یہ فصل فقط سنگینوں کی
جن کی نوکوں پر جھول رہی
مٹیالے، مکڑی جالوں سی
زور آور جلادوں کی ہنسی
مستور ہیں کیوں مہتاب ترے
پھانسی کے سیاہ نقابوں میں
کیوں رونقِ صحنِ مقتل ہیں
غنچے ترے سرخ گلابوں کے
سولی پہ سجائیں کس نے تری
آوازوں کی کچی کلیاں

یہ کن مستوں کے نعرے ہیں
کس لہو کے گاتے دھارے ہیں
اے رب دو عالم تو ہی بتا!
جو میرے دیس پہ چھائی ہے
وہ کیا شے ہے، وہ کیا ہے بلا(۱۴)

"تفصیل مسافت کی" ایسی نظم ہے جس میں زندگی کے پیچیدہ سفر کے متعلق اظہار خیال کرنے کی سعی نظر آتی ہے۔ یہ ایسا سفر ہے جس میں یقین اور انکار کی سرحدیں دھندلاہٹ کا شکار ہیں۔ انسان جب وقت کے سنگلاخ راستوں پر چلتے چلتے تھکنے لگتا ہے اور زندگی کی کٹھنائی اسے شل کر دیتی ہے تو سوالات کی ایسی دھند اسے گھیر لیتی ہے جس میں سچائی کی پہچان بھی مشکوک دکھائی دیتی ہے۔ نہ منزل کا پتہ چلتا ہے نہ ہم سفر کی صورت واضح رہتی ہے۔ گزرے ہوئے لمحات خواب و خیال ہی محسوس ہوتے ہیں۔ وہ اپنے اندر راز اور فریب سمیٹے یوں سامنے آتے ہیں جیسے کوئی چھپی ہوئی گواہی لیکن یہ گواہی بھی ادھوری اور مبہم ہے۔ دل میں یہ خلش جاگزیں ہوتی ہے کہ حقیقت کیا ہے؟ ہم نے جو جیا، وہ معتبر تھا یا محض ایک سراب ہی تھا؟

موہوم کشیدہ ہے
تصویر قیامت کی
شاید نہ سنا پائیں
تفصیل مسافت کی
لب بستہ رہیں شاید
یہ دن جو گزارے ہیں
محرم ہے کوئی کس کا
یا زخم کی سرگوشی
یا پیر ہمارے ہیں)۱۵)

فہمیدہ ریاض کے شعری مجموعے "آدمی کی زندگی" کی افتتاحی نظم "اس شہر میں" کی وساطت سے شاعرہ یادِ رفتہ کو تازہ کرتی دکھائی دیتی ہے۔ اب پہلے جیسا کچھ بھی نہیں، سب کچھ حیران کن حد تک بدلا ہوا ہے۔ گھروں اور درختوں وغیرہ کے نشانات مٹ گئے ہیں اور ان کی جگہ مارکیٹوں نے لے لی ہے یہ انقلاب کیوں کر برپا ہوا؟ یہ نظم ایک گہرے تشکیکی سوال سے شروع ہوتی ہے کہ اپنا ہی شہر اجنبی کیوں محسوس ہونے لگا ہے؟ شاعرہ اس تبدیلی کو محض خارجی منظر نامے تک محدود نہیں رکھتی بلکہ اپنی داخلی شناخت تک پھیلا دیتی ہے کہ جہاں نہ صرف پہچان دھندلا جاتی ہے بلکہ مانوس مناظر مٹ جاتے ہیں۔ یہ حالت وجودی تشکیک کو جنم دیتی ہے کہ کیا حقیقتاً وقت سب کچھ بدل دیتا ہے یا ہماری یادیں ہی محو ہو جاتی ہیں؟

ساتھ ہی اس میں سماجی تشکیک بھی ابھرتی ہے کہ شہر انسانوں اور رشتوں سے خالی ہو کر صرف بازاروں میں کیوں ڈھل گیا ہے؟ مادیت پرستی کا دور دورہ ہے اخلاقی اقدار پست ہو چکی ہیں۔ یہ الجھن قاری کو سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ پہچان، تعلق اور مانوسیت محض عارضی ہیں یا ان کے پیچھے کوئی پائے دار حقیقت بھی موجود ہے؟

اس شہر میں، مَیں اجنبی یوں تو نہ تھی میرے خدا
اس کی زمیں، اس کے فلک، اس کی ہوا کو کیا ہوا؟
پہچان میں آتا نہیں، پہچان بھی پاتا نہیں مجھ کو کوئی
بدلا ہوا سارا آسماں
ہے روشنی اتنی مگر کچھ بھی نظر آتا نہیں
گھر تھے یہاں
رہتے تھے جن میں کچھ مکیں
اک پیڑ تھا اس جا کھڑا
جھولا پڑا تھا ڈال پر
اک دوست رہتا تھا یہاں
کیوں مِٹ گئے سارے نشاں؟
اب تو فقط ہر موڑ پر، ہر گام پر
بازار ہے بازار ہے بازار ہے(۱۶)

نظم "کوتوال بیٹھا ہے" پہلی بار "ہمرکاب" میں چھپی۔ بعد ازاں کسی کی فرمائش پر انھوں نے دوبارہ اسی عنوان سے ایک اور نظم لکھی جو ان کے شعری مجموعے "آدمی کی زندگی" کا حصہ ہے۔ مذکورہ نظم سے ماخوذ درج ذیل بند میں شاعرہ نے دل کے صحرا میں کسی شے کے ٹوٹنے اور سلگنے کا ذکر کیا ہے مگر وہ اس کی حقیقت تک رسائی نہیں پا سکتی۔ "کیا تھا وہ؟ نہ جانے کیا!" ایسی کیفیت ابہام کو ظاہر کرتی ہے اور ابہام سے قاری شکوک و شبہات کے دائرے میں چلا جاتا ہے۔ کبھی یہ جذبہ خواہش کے فریب میں ملفوف ہے تو کبھی محض نظر کا دھوکا محسوس ہوتا ہے۔ عدم یقین کی یہ کیفیت کلام میں شک اور تذبذب کو اجاگر کرتی ہے جو انسان کو کسی ایک جواب تک محدود نہیں رہنے دیتی۔ اس نوع کے سوالات اور الجھنیں دراصل نفسیاتی تشکیک کی نمائندگی کرتے ہیں کیوں کہ شاعرہ اپنی داخلی کیفیت، احساس اور ادراک کی صداقت پر شک کرتی ہے:

اپنے دل کے صحرا میں
کوئی چیز ٹوٹی تھی

کوئی شے سلگتی تھی

کیا تھا وہ؟ نہ جانے کیا!

تھا فریب خواہش کا

یا نظر کا دھوکا تھا(۱۷)

زندگی چوں کہ اُردو شاعری کا مستقل موضوع ہے فہمیدہ ریاض نے بھی زندگی کو اپنے کلام کا حصہ بنایا ہے وہ زندگی کے رویے پر سوالات اٹھاتی ہیں۔ ان کے یہ سوالات فلسفیانہ تشکیک کا حصہ ہیں۔ انسان کی خواہشات اور باتوں کو زندگی کبھی اہمیت نہیں دیتی نہ اس کے کہنے پر چلتی ہے۔ یہ رویہ شاعرہ کو حیران کرتا ہے کہ زندگی آخر کیوں بے نیاز اور لاتعلق سی ہے؟ کبھی وہ سمندر کے کنارے خاموش بیٹھ کر کچھ سوچتی نظر آتی ہے گویا اپنی ہی دنیاؤں میں گم ہے۔ شاعرہ کے ذہن میں یہ شکوک ابھرتے ہیں کہ شاید زندگی خود سر ہے، ضدی ہے یا پھر انسان کی بات کو سننے کی عادی ہی نہیں؟

آدمی کی بات کیوں سنتی نہیں ہے زندگی؟

اس کے کہنے پر کبھی چلتی نہیں کیوں زندگی؟

اک سمندر کے کنارے

ہاتھ پر ٹھوڑی رکھے

سوچتی رہتی ہے کیا؟

زندگی خود سر ہے کیا؟

ضدی ہے کیا؟(۱۸)

فہمیدہ ریاض کی شاعری میں ایک مسلسل جستجو ہے جس میں تشکیک پسندی ایک نمایاں وصف کے طور پر سامنے آتی ہے۔ یقین سے زیادہ جستجو اور تسلیم سے زیادہ تردید کا رویہ فہمیدہ کے شعری مزاج کو تشکیکی جہت عطا کرتا ہے۔ جس کی بنا پر ان کی نظموں میں پائے جانے والے تشکیکی عناصر کا تحقیقی مطالعہ نہ صرف ان کے فکری پس منظر کو واضح کرتا ہے بلکہ ان کی شاعری کی معنوی گہرائیوں کو بھی منکشف کرتا ہے۔ تشکیکیت کے ذریعے شاعرہ، حقیقت کے مخفی پہلوؤں کو تلاش کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ روایتی اقدار، سماجی رسوم اور جامد فکری سانچوں کو سوالیہ نگاہ سے دیکھتی ہے اس کے ہاں سوالات محض اعتراض کی صورت میں نہیں آتے بلکہ ان میں جستجو، تلاش اور فکری بیداری کی لہر موجود رہتی ہے۔ وہ روایت، مذہب، سماج اور انسان کے باطنی وجود ہر سطح پر سوال اٹھاتی نظر آتی ہیں۔ ان کے اشعار میں یہ سوالات کبھی داخلی اضطراب کی صورت میں، کبھی وجودی تنہائی کے احساس میں، کبھی اسرارِ کائنات کو سمجھنے کی تڑپ میں تو کبھی مذہبی پہلو سے ظاہر ہو کر ان کی نظموں کو فکری وسعت عطا کرتے ہیں اور انھیں محض جذباتی یا نسائی اظہار سے بلند کر کے ایک فلسفیانہ سطح پر لے آتے ہیں۔ ان کی شاعری قاری کو سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ سچ کیا ہے؟ حقیقت کس رخ پر ہے؟ کیا ہمارے مروجہ تصورات واقعی اتنے مستند ہیں جتنا ہمیں باور کرایا جاتا ہے؟ ڈاکٹر سلیم اختر کے بہ موجب؛

"فہمیدہ ریاض کا باغیانہ لہجہ فیشن کی بنا پر نہیں کہ یہ شعورِ حیات کے ساتھ ساتھ شعارِ زیست بھی ہے۔ اس نے "بدن دریدہ" کے پیش لفظ میں لکھا تھا۔ "شاعر ایک دیوار سے اپنا سر پھوڑتا ہوا خود کلامی کرتا ہے"۔ چنانچہ بدن دریدہ کے بعد طبع ہونے والے مجموعوں "دھوپ"، "کیا تم پورا چاند نہ دیکھو گے؟" اور "ہم رکاب" کے مطالعہ کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ اس نے اپنی دیوار دریافت کر لی ہے اب وہ خود کلامی کے گنبدِ بے در سے باہر نکل آئی ہے اور اپنے عصر سے مکالمہ کر رہی ہے جس کے نتیجہ میں شاعری نے نوشتۂ دیوار کی صورت اختیار کر لی۔ خاموشی کے دور میں فہمیدہ ریاض فرضِ کفایہ ادا کر رہی ہے۔"(۱۹)

فہمیدہ کی شاعری میں تشکیک پسندی بنیادی عناصر میں سے ایک ہے ان کے ہاں تشکیک صرف ایک ادبی حربہ نہیں بلکہ ایک فکری تحریک بھی ہے۔ وہ سوال اٹھانے، حقیقت کی جستجو کرنے اور ہر چیز کو تنقیدی نظر سے دیکھنے کا درس دیتی ہیں۔ ان کی شاعری نے اردو ادب کو ایک نئی سمت دی اور معاشرتی تبدیلی کے لیے ایک فکری بنیاد فراہم کی۔ ان کے ہاں تشکیک محض انکار نہیں بلکہ نئے امکانات کی جستجو اور فکری آزادی کی علامت بن جاتی ہے۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ فہمیدہ ریاض کی شاعری میں تشکیکی عناصر صرف فکری انحراف نہیں بلکہ ادبی و فکری ارتقا کا استعارہ ہیں۔ مزید یہ کہ ان کی شاعری تانیثی شعور یا احتجاجی جذبے سے بڑھ کر ایک عمیق فکری جستجو کی نشانی بھی ہے۔ زندگی کے تلخ تجربات اور انسانی رویوں کی پیچیدگیوں کو شکوک و شبہات کے دائرے میں لا کر پرکھنے کا انداز بھی فہمیدہ کے ہاں ملتا ہے۔ ان کی نظمیں روایتی بیانیے کو مسترد کرتے ہوئے نئے معانی تلاش میں کوشاں نظر آتی ہیں۔ ان کے ہاں یقین اور گمان کی کشمکش ایک مستقل فکری جدوجہد کی علامت ہے۔ جس کے ذریعے وہ نہ صرف اپنی ذات کی حدود کو پرکھتی ہیں بلکہ معاشرتی اور فکری جمود کو بھی چیلنج کرتی ہیں۔ اس عمل میں فہمیدہ کا لہجہ کبھی احتجاجی، کبھی متحیر اور کبھی متجسس بن جاتا ہے ان کی شاعری میں یہ تشکیکی لہجہ دراصل جستجو اور فہم کی علامت ہے جو ان کے فکری نظام کا بنیادی جزو بن جاتا ہے۔
ان کی تشکیک پسند شاعری کو ادبی حلقوں میں مختلف ردعمل ملا۔ ترقی پسند نقادوں نے اسے ایک جرأت مندانہ اور بیدار فکر شاعری قرار دیا جب کہ روایتی حلقوں نے اسے بغاوت سمجھا۔ فہمیدہ پر فحاشی اور الحاد کے الزامات بھی لگائے گئے، تاہم ان کی شاعری نے جدید اردو ادب پر گہرے نقوش چھوڑے جو ان کے شعری مزاج کی وسعت کا ثبوت ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ خالدہ حسین، "نسائی خود شناسی اور فہمیدہ ریاض"، مشمولہ سہ ماہی ادب ساز، مدیر: نصرت ظہیر، دہلی: ادب ساز پبلی کیشن، جلد ۲، شمارہ ۳ (اپریل تا جون ۲۰۰۷ء)، ص۔ ۱۰۷

۲۔ فہمیدہ ریاض، سب لعل و گہر (کلیات)، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، ص: ۳۹

۳۔ ایضاً، ص: ۸۳

۴۔ ایضاً، ص: ۹۱

۵۔ ایضاً، ص: ۱۱۵

۶۔ ایضاً، ص: ۱۱۸

۷۔ ایضاً، ص:۱۲۰
۸۔ ایضاً، ص:۱۲۸
۹۔ ایضاً، ص:۲۶۹، ۲۷۰
۱۰۔ ایضاً، ص:۲۷۰
۱۱۔ ایضاً، ص:۲۸۳
۱۲۔ برٹرینڈ رسل، برٹرینڈ رسل کے تشکیکی مضامین، مترجم: حسین بن خامس، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۰۷ء، ص،۱۲۶
۱۳۔ فہمیدہ ریاض، سب لعل و گہر (کلیات)، ص:۳۸۱
۱۴۔ ایضاً، ص:۳۸۵
۱۵۔ ایضاً، ص:۳۹۸
۱۶۔ ایضاً، ص:۴۵۷
۱۷۔ ایضاً، ص:۴۸۷
۱۸۔ ایضاً، ص:۴۹۳
۱۹۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، فلیپ "میں مٹی کی مورت ہوں" از فہمیدہ ریاض، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۸ء

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

Roman Havalajat

1.Khalida Hussain, “Nisai Khud-Shanasi aur Fehmida Riaz” Seh-Maahi Nusrat Zaheer, Delhi: Adab Saaz Publication, vol. 2, no. 3 (April–June 2007), P:107
2 .Fehmida Riaz, Sab La’l-o-Gohar (Kulliyat), Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2011, Page:39
3 .ibid, P:83
4 .ibid, P:91
5 .ibid, P:115
6 .ibid, P:118
7 .ibid, P:120
8 .ibid, P:128
9 .ibid, P:269-270
10 .ibid, P:270
11 .ibid, P:283
12 .Russell, Bertrand. Skeptical Essays. Translated by Husain bin Khamis. Lahore: Fiction House, 2007. P:126
13 .Fehmida Riaz, Sab La’l-o-Gohar (Kulliyat), P:381
14 .ibid, P:385
15 .ibid, P:398
16 .ibid, P:457
17 .ibid, P:487
18 .ibid, P:493
19. Saleem Akhtar, Dr. “Critical note.” On the flap of Fehmida Riaz, Main Mitti Ki Moorat Hoon. Lahore: Sang-e-Meel Publications, 1988.